اس سے پہلے کی مرقومہ یا تفکر شدہ تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتا۔ ہر شخص سائنس کے معمولی مفروضوں سے لے کر بلند سائنس کے پیچیدہ رمزی قاعدوں سے بہ طیب خاطر واقف تھا اور ہر مشاہدے کی جمع بندی بڑی آسانی کے ساتھ خود ہی کر لیتا تھا۔

یہ وہ عہد تھا جس کا معمولی سے معمولی مزدور اور ادنیٰ سے ادنیٰ کارکن بھی سائنس کے عمومی تقاضوں کو ٹاک براہے، کوپرنیکس، گلیلیو، نیوٹن اور آئن سٹائن سے بہتر سمجھتا تھا اور اس کی راہ میں کوئی اُلجھن یا کٹھنائی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ وہ لوگ علم کی ایسی بلندیوں پر پہنچ چکے تھے کہ اُن کے درمیان کسی قسم کی منافقت، پرخاش یا کھٹاپٹی باقی نہیں رہی تھی۔

مگر اس روش تک علم کے پھیل جانے کی وجہ سے لوگ بڑے پرسکون تھے۔ اُن کو سکونِ دل بھی میسر تھا اور سکونِ جان بھی اور وہ مجموعی اعتبار سے سکونِ خانہ اور سکونِ معاشرہ کی مشترکہ نعمت سے فیض یاب تھے۔

"ماہڑا" کے لوگ چونکہ خیریت و عافیت کے چھتر تلے زندگی بسر کر رہے تھے اور وہ سارے سوالوں کے جواب نکال کر فارغ ہو گئے تھے اور اُن کے پاس تحیر، تجسس اور تیج کاوی کے لئے کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا اس لئے وہ گروہ در گروہ تنزل اور انحطاط کی طرف جانے لگے تھے اور اُنہوں نے اپنے زوال کے لئے وہی راہ اختیار کر لی تھی جو رو بہ انحطاط قومیں اپنی بے علمی، بے عملی اور عیش پسندی کے زمانے میں اختیار کر لیا کرتی ہیں۔ راستہ وہ نہ تھا جو سپین کے آمروں، مغل سلطنت کے شہنشاہوں، رومتہ الکبریٰ کے سینٹروں اور اودھ کے تاج داروں نے اختیار کیا تھا لیکن منزل وہی تھی..... تنزل، انحطاط اور زوال کی منزل۔ اُنہوں نے جہالت کا راستہ اختیار کیا تھا اور ماہڑا والوں نے علم کا لیکن انجام ایک سا رہا!

اٹالدی اور چیک ماہرین کا اندازہ تھا کہ "ماہڑا" میں علم کی فراوانی اور سائنس کے پھیلاؤ کا یہ دور دس سال سے زیادہ کی مدت پر محیط نہیں تھا لیکن کیرولین اور جوزف اُسے پوری نصف صدی پر پھیلا ہوا سمجھتے تھے اور اس کے ٹھوس دلائل مہیا کرتے تھے کہ اتنے علم کے باوجود اور ہر شے کو جان چکنے کے باوصف ماہڑا کی سنگ لیشب کی تختیوں پر تین نظمیں، پانچ لوک کہانیاں اور ایک بیان ایسی لوک دانش کا بھی

ملتا ہے جس میں اس وقت کے محاورے، ضرب الامثال، کہاوتیں اور اکھان وغیرہ درج ہیں۔ ان دونوں میاں بیوی کا یہ کلیم تھا کہ سائنسی علوم سے سو فیصدی جان کاری کے باوصف ماہڑا کے پانچ آدمی اب بھی تحیر اور تجسس میں مبتلا تھے اور وہی لوگ نظمیں اور کہانیاں لکھا کرتے تھے۔ اُن میں سے ایک کی نوجوان بیٹی بھی تھی جو شہزادہ جاہریا کے عشق میں مبتلا تھی۔ یہ لڑکی اپنے گہرے عشق اور لگن پریم کی وجہ سے علم پر توجہ نہ دے سکی تھی اور ناخواندگی کی وجہ سے نظمیں بنایا کرتی تھی — اُن چند نوشتوں سے اور اُن کے مضامین کے موضوعات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ "ماہڑا" کی تہذیب کم و بیش نصف صدی پر محیط رہی اور یہاں کے لوگوں نے اپنے ہنر و خبر کی بدولت اور علوم کیمیا، سمیا، اور ریمیا کو اپنا کر ایسی کامیاب زندگی بسر کی جس کے خواب آج کا زمانہ اور اس دور کا ہر فرد دیکھ رہا ہے۔ لیکن سائنس نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی جتنی "ماہڑا دور" میں ہو چکی تھی!

حال ہی میں ماہڑا کے کھنڈرات سے تانبے کی ایک ایسی تختی ملی ہے جس پر بارہ کے بارہ دیوتاؤں کی خطی تصویریں ہیں۔ یہ تصویریں دھوپ کی روشنی میں، بلب کی روشنی میں اور موم بتی کی روشنی میں الگ الگ احوال بیان کرتی ہیں اور اُن دیوتاؤں کے فعل مختلف صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ کیرولین کا اندازہ ہے کہ یہ ایک الیکٹرانک پلیٹ ہے جس کے اندر ایسے Chip لگے ہیں جو ظاہری آنکھ کو نظر نہیں آتے۔ جب اس پلیٹ کو میگنیٹک فیلڈ سے گزارا جاتا ہے تو اس میں سے اُس عہد کے درندوں کی دھاڑیں اور چنگھاڑیں سنائی دینے لگتی ہیں۔

جوزف اور کیرولین کی تحقیق کے مطابق تانبے کی یہ تختی اُس تہذیب کا تاریخی عہد متعین کرنے میں مدد ثابت ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس کی مٹتی ہوئی جھریٹ سے اس عہد کا ریکارڈ کیا ہوا یہ فقرہ پورے کا پورا سمجھ میں آ جائے جو شروع تو یہاں سے ہوتا ہے کہ "آہ ہم کو علم کی فراوانی اور دانش کی افراط اور حیرت و تحیر کی نایابی نے برباد کیا! کاش ہمارے سائنسی پروہت اور فنی کرمچاری ....." لیکن اس کے بعد آواز ڈوب جاتی ہے۔ آڈیو سگنل تو آتا ہے لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آتے۔

ان الفاظ کو سننے اور سمجھنے کے لئے کیرولین یہ تختی ایک مخملی بیگ میں پیک کر

کے ایم آئی ٹی کی الیکٹرانک لیبارٹری میں پہنچ چکی ہے۔ لیکن جوزف کہتا ہے "کیرولین بکواس کرتی ہے۔ وہ تختی ٹیسٹ کروانے یا اس کی آواز سننے نہیں گئی بلکہ اپنے پرانے یار سے ملنے گئی ہے جو الیکٹرانک لیب میں کام کرتا ہے۔ وہ دونوں نئے سرے سے میگنیٹک فیلڈ سے گزر کر دیکھیں گے کہ کیرولین کے شادی کر لینے کے بعد بھی اُن دونوں کے درمیان کس قدر محبت باقی ہے..... اُن کے پول ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں یا جھٹکے مار کر دھکا دیتے ہیں۔ اگر تو ان دونوں کے درمیان وہ پرانی کشش قطعی طور پر متعین اور مصمم ہو جاتی ہے پھر تو کیرولین واپس نہیں آئے گی اور اسی حرام زادے کے فلیٹ میں چلی جائے گی — لیکن میرا مشاہدہ بتاتا ہے اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہ واپس نہیں آئے گی۔ ٹھیک ہے نہ آئے۔ رہے اُسی کے پاس — مرے یا جیئے، مجھے اس سے سروکار نہیں لیکن تحقیق کا کام نہیں رکنا چاہیے۔ اب میں یہ کام اکیلا کروں گا اور اس حقیقت کی تلاش کرکے رہوں گا کہ ماہڑا نامی بستی کے لوگ اتنی عظیم اور ارفع سائنسی ترقی کے باوجود وفا آشنا کیسے رہے اور ان کے اندر انسانی قدریں کیونکر بحال رہیں!"

آج کل جوزف کی غیر ملکی مالی امداد بند ہو چکی ہے اور وہ ساہیوال کے ایک ڈھابے میں فقیرانہ زندگی بسر کر رہا ہے — مگر تحقیق کا سلسلہ جاری ہے!

قلارے

کیا آپ جانتے ہیں کہ اس وسیع و عریض کائنات میں اور سیاروں ستاروں کی حسین و جمیل دُنیا میں آپ اپنی پسند کا ایک ستارہ خرید کر اُسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال بھی سکتے ہیں اور اس کی لینڈ سکیپنگ کر کے وہاں اپنی مرضی کا سائن بورڈ بھی لگا سکتے ہیں۔

ابھی تک کوئی دس بارہ ہزار ستارے بک چکے ہیں اور تقریباً تمام خریدنے والے اُن کا قبضہ بھی لے چکے ہیں۔ اُن ستاروں کی خرید و فروخت کا کام دُنیا کے سبھی ترقی یافتہ ملکوں میں ہوتا ہے لیکن امریکا کے رئیل اسٹیٹ اداروں کا اس بزنس پر خصوصی قبضہ ہے۔ اگر آپ امریکا سے باہر رہائش پذیر ہیں تو 800-323-0766 پر فون کر کے اپنی پسند کا ستارہ خرید سکتے ہیں۔ پہلے تو تیس ڈالر میں اس دنیا کے لگ بھگ ایک بہت ہی اچھا ستارہ مل جاتا تھا لیکن اب عالمی مہنگائی کے پیش نظر اس کی قیمت میں سو فیصد اضافہ ہو گیا ہے۔ ساٹھ ڈالر میں ایک خوبصورت اور "چمک دار" ستارے کا پورے کا پورا مل جانا ایسی بڑی جائیداد غیر منقولہ ہے جو آپ کی اگلی سو بلکہ اس سے بھی زیادہ پشتوں کے کام آ سکتی ہے۔ اور آپ بڑے سکون اور تسلّی کے ساتھ سفر آخرت کر سکتے ہیں کہ اپنے لواحقین کے لئے اتنا بہت کچھ چھوڑ مرے!

یہ ستارے آپ کسی بھی ملک کے پراپرٹی ڈیلر سے خرید سکتے ہیں لیکن اُن کی رجسٹری اور ان کی جمع بندی کا کام بہرحال سوئزر لینڈ میں ہو گا۔ کل کائنات کے ستاروں کا محکمہ مال سوئزر لینڈ میں ہے جہاں سودا ہونے کے بعد اعلیٰ درجے کے بانڈ پیپر پر لیزر پرنٹنگ میں رجسٹری کا کاغذ تیار ہوتا ہے۔ اس رجسٹری کی نقل بڑی حفاظت کے ساتھ جنیوا کے مال خانے میں رکھی جاتی ہے۔ پھر اس کے کوائف کا پورا اندراج لائبریری

آف کانگرس کے رجسٹر میں ہوتا ہے اور اس اندراج کے بعد جنیوا کے دفتر سے اصل رجسٹری خریدار کو بھجوا دی جاتی ہے۔

اس رجسٹری کے ساتھ ایک خوبصورت چارٹ بھی سپلائی کیا جاتا ہے جس میں کائنات کی اس سائیڈ کے ستاروں کا نقشہ ہوتا ہے جہاں آپ نے ستارہ خریدا ہوتا ہے۔ اس خوبصورت اور رنگین چارٹ کے اندر ستاروں کی پوزیشن میں آپ کے خریدے ہوئے ستارے کی وضاحت اور اس کے رقبے کی تفصیلات چارٹ کے حاشیے پر رقم ہوتی ہیں۔

مردان کا خوبصورت شہزاد جو گزشتہ تین سال سے ایم آئی ٹی میں ایسٹروفزکس میں ایم ایس سی کر رہا تھا ایک روز بالکل تھک گیا۔ وہ جو ایکوئیشنز حل کر تھا اُن سے گندھک اور گندے بروزے کی ایسی بدبو اُٹھنے لگی تھی کہ وہ گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر سڑک کنارے سبزے کے ساتھ ساتھ چل کر اُس کو آزادی اور تروتازگی کا احساس ہوا تو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کی دراز قد، خوش پوشاک، خوش ادا اور تھرکوا منگیتر رعنا اس کے پیچھے بھاگی چلی آ رہی تھی۔ شہزاد دونوں بازو کھول کر کھڑا ہو گیا تو رعنا اس کے قریب سے غزال تاتاری کی طرح چوکڑیاں بھرتی آگے کو نکل گئی۔ اور جب شہزاد کے اُٹھے ہوئے بازو اپنے پہلوؤں پر گر گئے تو رعنا کا ہیولا ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

جب وہ واپس اپنے کمرے میں پہنچا تو اس کے کاغذ، گراف اور لاگ رتھم ابھی تک ویسے ہی کھلے پڑے تھے اور اُسے اپنے حصے کی اسائن منٹ ختم کر کے لیٹنا تھا۔

یہ جو رعنا اپنے پھول دار بہاریہ لباس میں اس کے قریب سے گریز کرتی ہوئی نکلی تھی تو شہزاد کچھ مشکوک سا ہو گیا تھا۔ شک کرنے کی کوئی خاص وجہ تو نہیں تھی لیکن وہ جس قبیلے میں پیدا ہوا تھا اس تعلق سے شہزاد کو ہر آہٹ پر شک کرنے کا پورا پورا اختیار تھا۔ اس کے اندر کئی صدیوں سے چٹانوں کے پیچھے کی آہٹ خبردار کرنے کا ایک ذریعہ بن چکی تھی اور اب جو رعنا اس کے بہت ہی قریب سے کھٹ مار کے گزری تھی اور رکنے کی کوئی رمز یا اشارہ نہیں دیا تھا تو شہزاد کے اندر ایک وسوسے کا پیدا ہونا لازمی سا ہو گیا تھا۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر سر کو ایک زور کا جھٹکا دیا اور کام

میں معروف ہو گیا۔

رعنا نے فیکس پر شہزاد کو اپنے نئے چارکول ڈیزائن کا چربہ بھیجا تھا جس میں وہ ستاروں پر پاؤں دھرتی اُوپر ہی اُوپر چڑھتی جا رہی ہے اور چھوٹے چھوٹے سیارچے خلخال بن کر اس کے پاؤں کے گرد بجتے چلے جا رہے ہیں۔ خاکے کے کونے میں لکھا تھا "میں تم سے بہت ہی پیار کرتی ہوں۔ بتاؤ میں کیا کروں؟"

شہزاد نے اپنی محبوب منگیتر سے بالکل تنہائی میں اور ایک گہرے سناٹے میں ملنے کے لئے ساٹھ ڈالر کا ایک نہایت ہی خوبصورت ستارہ خریدا اور اُسے "قلارے" کا نام دے کر رجسٹری کے لئے جنیوا اطلاع بھجوا دی۔

لیکن جب وہ ستارہ خرید چکا اور ادائیگی کر چکا تو اُسے پتہ چلا کہ ایک دوسرے کے گرد گھومنے والے ستاروں کا ایک جوڑا ایک سو بیس کے بجائے سو ڈالر میں مل جاتا ہے۔ اُن میں دو محبت کرنے والے اپنے اپنے مدار میں رہ کر ہر گھوم پر ایک دوسرے سے بغلگیر بھی ہو سکتے ہیں اور ایک دوسرے کو چوم بھی سکتے ہیں۔ اُسے افسوس تو ضرور ہوا کہ ایسے سودے کا بعد میں علم ہوا لیکن اتنی بڑی موجود جائیداد کا واحد مالک ہونے پر خوشی بھی بے انتہا ہوئی۔ اس ستارے میں کئی مردان، کئی پاکستان، کئی ایشیا، کئی افریقہ اور کتنے ہی گوبی، کالاہاری اور بحرالکاہل ایک ساتھ سما سکتے تھے۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ پردیس میں، ایک طالب علم کی حیثیت سے رہ کر بھی اس نے اتنی بڑی جائیداد بنا لی۔

جب شہزاد نے رعنا کو ای میل کے ذریعے اطلاع دی کہ اُس نے کہکشاں سے بائیں ہاتھ، بہت نیچے، اُفق کے قریب بھورے رنگ کا ایک ستارہ خرید لیا ہے اور اس کی رجسٹری کے کاغذات سیدھے رعنا کو روانہ کر دیئے ہیں تو پہلے تو رعنا کو کچھ سمجھ نہ آئی کہ شہزاد کہہ کیا رہا ہے لیکن جب اس کو رجسٹری کی تفصیلات اور ستاروں کے جھرمٹ میں اس کے ستارے کا محل وقوع اور شجرہ موصول ہوا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ یہ سب کچھ اُٹھا کر بھاگی بھاگی پروفیسر ندیم کے کمرے میں پہنچی جہاں وہ ایک بڑی میورل پر چپڑا لاکھ کا ٹرانس پیرنٹ کوٹ دے رہے تھے۔ سارے کمرے سے نتھیاگلی کے پہاڑوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ پروفیسر ندیم کے سانس سے پرسکون، خاموش

اور چپ چاپ بہتے ہوئے ٹھنڈے پانیوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اپنی میورل سے بہت خوش تھے اور اُن کی میورل اپنے وجود میں آنے پر اُن سے بھی زیادہ خوش تھی۔

رعنا ٹیکسٹائل ڈیزائن کی طالبہ ہونے کی بنا پر پروفیسر ندیم کی شاگرد تو نہ تھی لیکن اس کو سارے سٹاف میں ایک یہی اُستاد سب سے اچھے لگتے تھے کہ یہ رافیل جیسے حسین اور مائیکل اینجلو جتنے محنتی تھے۔ اگر دانتے کی جوانی کی کوئی تصویر ہوتی تو وہ یقیناً پروفیسر ندیم کی شبیہ ہوتی۔ چونکہ وہ جوانی کے دانتے اور آج کے دانتے تھے اس لئے رعنا دل ہی دل میں بیٹرس بن گئی تھی اور اس کی روزمرہ کی پیش قدمیاں کالج میں کافی واضح ہو گئی تھیں۔

رعنا بھاگی بھاگی پروفیسر ندیم کے کمرے میں داخل ہوئی اور پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولی "سر ہم نے ایک ستارہ خرید لیا ہے..... کہکشاں کے بائیں ہاتھ، عین نیچے، اُفق کے قریب۔ چاند سے پچیس لاکھ میل دور بھورے رنگ کی زمین ہے سر اور جامنی کلر کا آسمان۔ آپ چلیں گے دیکھنے؟"

پروفیسر صاحب نے ہنس کر کہا "اگر تم ساتھ لے جاؤ گی تو ضرور چلیں گے ورنہ ہم تو راستے میں ہی بھٹک جائیں گے۔"

رعنا نے کہا "نہیں سر، ہم اکٹھے جائیں گے اور اکٹھے وہاں پکنک منائیں گے۔" پھر اس نے ذرا اترا کر کہا "شہزاد نے خریدا ہے سر، فارن ایکسچینج میں پے منٹ کر کے۔ میں آپ کو اس کا نقشہ دکھاتی ہوں اور اس کا مقام سمجھاتی ہوں۔"

پھر اس نے فیکس میں آئے ہوئے چارٹ پروفیسر صاحب کی میز پر پھیلا کر اپنے ستارے کی سچوئیشن سمجھانی شروع کر دی۔ چارٹ میں ستارے کے سارے کوائف درج تھے اور اس کا ہر مقام کرہ ارض کے حوالے سے متعین کیا گیا تھا۔ رجسٹری کی کاپی دیکھنے کے بعد پروفیسر ندیم نے پوچھا "یہ سارا ستارہ تم لوگوں کا ہے؟" تو رعنا نے گھمنڈی لڑکی کے انداز میں اٹھلا کر کہا "سارے کا سارا ہمارا سر، لیکن اس میں ایک ملک آپ کا بھی ہو گا..... جونسا آپ پسند فرمائیں..... جہاں آپ اپنی حکمرانی قائم کرنا چاہیں..... جہاں آپ اپنا ٹکٹ سکہ چلانا چاہیں۔"

پروفیسر ندیم نے اس کے لفظ "جون سا" پر محبت بھری نظروں سے رعنا کو دیکھا

اور پھر سوچا کہ چار سال پیشتر تھرڈ ائیر کی ایک اور لڑکی بھی اُن کی شخصیت کے سحر میں اسی طرح گرفتار ہو گئی تھی اور اُسے بڑی مشکل سے دھکے دے کر باہر نکالنا پڑا تھا۔ پروفیسر ندیم چونکہ ٹھرکی قسم کے مرد نہیں تھے اس لئے اُن کی شخصیت میں ایک ایسی موہنی تھی کہ زہری سے زہری ناگن بھی اُن کے آگے بینتی کرتے ہوئے لہرانے لگتی تھی۔

رعنا نے کہا "آپ میرے ساتھ ہمارے ستارے میں چلیں گے ناں سر؟"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں" پروفیسر ندیم نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا "ضرور چلیں گے اور پھر سارا دن تم لوگوں کے ساتھ گزاریں گے۔"

رعنا نے کہا "سر ہمارا ستارہ ایسے محفوظ مقام پر واقع ہے کہ وہاں نہ تو اُسے کسی بلیک ہول کا خطرہ لاحق ہے اور نہ ہی اس کے قریب کوئی کس کی آبادی ہے۔ بس سکون ہی سکون ہے، محبت ہی محبت ہے۔"

پروفیسر ندیم نے مسکرا کر کہا "تم تو اپنے ستارے کی باتیں ایسے کر رہی ہو جیسے تم نے اُسے گھوم پھر کر دیکھا ہو!"

رعنا نے کہا "سر! میں ابھی وہاں گئی تو نہیں البتہ میں نے اُسے چشم تخیل سے ضرور دیکھا ہے اور اُسے اپنی آرزوؤں کے عین مطابق پایا ہے۔" پھر اس نے اندر ہی اندر خوش ہو کر کہا "سر! اگر آپ کی بیگم ہوتیں تو ہم اُنہیں بھی ساتھ لے چلتے، لیکن آپ نے شادی ہی نہیں کی — آپ نے کیوں شادی نہیں کی سر؟"

"کی ہے بھائی، کی ہے۔" اُنہوں نے پھر اس کے کندھے پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "یہ میرا فن میری شادی ہی تو ہے اور یہ میری پینٹنگز اور میورلز میری دلہنیں ہی تو ہیں۔ اس کے سوا مجھے اور کیا چاہیے!"

رعنا کو پروفیسر صاحب کے منہ سے یہ سن کر اور بھی اچھا لگا کہ اُنہوں نے شادی نہیں کی اور آئندہ بھی ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں لیکن وہ اپنے مزاج کے مطابق محبت اور رومانس کے اردگرد گھومتے ضرور رہیں گے۔

شہزاد اپنی یونیورسٹی کی آبزرویٹری میں گھس کر رات رات گئے تک اپنے ستارے کو غور سے دیکھا کرتا اور ابراہیمی مسلک کے مطابق یہی سوچتا رہتا کہ شاید یہ

ہے میرا ستارہ۔ صبح ہو جاتی اور وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکتا۔ اس کا خیال تھا کہ ان بہت سارے ستاروں میں سے تین ایسے ضرور ہیں جن میں سے ایک اس کا اپنا زرخرید ستارہ ہے اور اس کے اندر کچھ ایسے عجائبات ضرور موجود ہیں جنہوں نے اس ستارے کو ایک خصوصی مقام عطا کر رکھا ہے۔ اُسے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ ایک روز جب وہ وہاں پہنچے گا تو بہت ساری حقیقتیں عیاں ہو کر اس کے قدموں میں مصر کے بازار کی طرح پھیل جائیں گی۔

اُنہی دنوں ہبل دوربین نئی نئی بن کر اپنی رصدگاہ میں فٹ ہوئی تھی۔ شہزاد نے اس رصدگاہ میں پہنچنے کے لئے ان تھک کوششیں کیں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ہبل دوربین سکیورٹی کا بہت بڑا مسئلہ تھی اس لیے کسی غیر معروف سکالر یا نامطلوب طالب علم کو اس علاقے میں پہنچنے کی اجازت ہی نہ تھی۔

رعنا نے جب اپنے ابا جی کو بتایا کہ شہزاد نے کہکشاں کے قریب ایک ستارہ خرید کر اُسے اپنے نام چڑھوا بھی لیا ہے تو اُن کو اپنی سب سے ذہین اور سب سے خوبصورت بیٹی کی فکر لاحق ہو گئی کہ شادی کے بعد جب وہ اپنے سسرال جا کر ایسی باتیں کرے گی تو اس کا کیا بنے گا!

شہزاد کی آرزو تھی کہ وہ رعنا کو بتائے بغیر اکیلا کسی روز "قلارے" جائے اور وہاں سب کچھ سیٹ کر کے اور مرغزاروں، وادیوں، کہساروں اور جنگلوں کی تزئین کر کے چپ چاپ واپس آجائے۔ اور پھر جس روز وہ رعنا کو ساتھ لے کر اپنے علاقے میں پہنچے تو رعنا خوشی کی ایک چیخ مار کر اس کے سینے سے چمٹ جائے کہ واہ شہزاد، تو نے کمال کیا..... اپنے باپ دادا کا نام روشن کر دیا۔ شاباش و شاد زی!

اُنہی دنوں ہوسٹن میں ہمالیہ کا ایک یوگی آیا تھا جس کے چیلوں کا دعویٰ تھا کہ گورو مہراخ کی عمر پانچ سو برس کی ہے اور یہ دوسری مرتبہ اپنی گپھا سے برآمد ہوئے ہیں۔ گورو مہراخ کپالی چڑھا کر بیٹھ جاتے تھے اور سو سو ڈیڑھ سو برس ایسے ہی گزار دیتے تھے۔ ان دنوں یہ گورو صاحب امریکا میں سدھی کا درس دینے آئے تھے اور دُکھی جنتا کو یہ بتانے آئے تھے کہ یہ مال و دولت دُنیا سوائے وہم و گمان کے اور کچھ بھی نہیں..... انسان اس سے اُوپر ہو کر زندگی گزارنے کے لئے آیا ہے اور وہ مارگ جو اس

نے ہزاروں ورش پہلے چھوڑ دیا تھا، اُسے ڈھونڈنے کے لئے آیا ہے۔

امریکا کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جوق در جوق ہوسٹن کی طرف رجوع کرنے لگے اور دیکھتے دیکھتے وہاں لاکھوں کا مجمع لگ گیا۔ شہزاد بھی بوسٹن سے کھسک کر ہفتہ بھر کی سدھی کا سبق لینے ہوسٹن پہنچ گیا اور وہاں کی بھیڑ میں رل مل گیا۔

گورو دیو کے ایک سو پچاس چیلے مختلف گروہوں میں سدھی کا درس دیتے تھے اور ایک ہفتے میں بندا تیار کر کے اُوپر اُٹھا دیتے تھے — اپنے کنول آسن کے پانچویں روز شہزاد نے محسوس کیا کہ وہ زمین سے اُوپر اُٹھ رہا ہے اور کمرے میں میز کی سطح پر آ گیا ہے۔ اس سے اُوپر اُس سے اُٹھا نہ گیا اور وہ واپس زمین پر لینڈ کر گیا۔

بوسٹن واپس پہنچ کر اُس نے اپنی مشق جاری رکھی اور وہ رات کی تاریکی میں سطح زمین سے سو سو فٹ اور اُوپر اُٹھ کر پھرنے لگا اور سوئے ہوئے بوسٹن کی سیر کرنے لگا۔ واہ! کیا سیر تھی..... کیا مزے تھے اور کیسی لذت تھی کہ اس کی دھت اور چاٹ بھوگ اور رنگ رس سے بھی اُوپر نکل گئی۔

ایک روز شہزاد اپنی سدھی کے نشے میں بدمست، انجام سے بے خبر، مال سے لاتعلق اپنے مقدور اور مجال سے آگے نکل گیا۔ جونہی گورو مہراخ کے بتائے ہوئے مارگ سے سمرتھ اُوپر نکلا تو پھر آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ اب سدھی اس کے اختیار میں نہیں رہی تھی، وہ سدھی کے کنٹرول میں آ گیا تھا۔ ژوں ژوں کرتے ستارے اور سیارے اس کے قریب سے گزر رہے تھے اور وہ کڑی کمان کے تیر کی طرح اُوپر ہی اُوپر چلا جا رہا تھا۔

کچھ مانوس ستاروں کے ایک محلے سے گزرتے ہوئے شہزاد نے حبس دم کر کے اپنے آپ پر بوجھ ڈالا اور اس کی رفتار بالکل مدھم پڑ گئی۔ جیسے تیز رفتار جہاز کو ایک دم روکنے کے لئے اُس کی دم سے بڑا سا پیراشوٹ نکل کر مخالف سمت کھینچ مارا کرتا ہے، عین اسی طرح شہزاد بھی رکنے لگا۔

اس کا اپنا ستارہ "قلارے" اس کے قدموں کے سامنے کھلی ہوئی کتاب کی طرح پڑا تھا اور اس کا اُوپر کا حصہ، جہاں صفحہ نمبر لکھے ہوتے ہیں، قدرے اُٹھا سا ہوا تھا۔ عین اس طرح جس طرح خوبصورت باغوں کے سرسبز لانوں پر لڑکے لڑکیاں بیٹھے ہوتے ہیں

اور لڑکوں نے مجسم توجہ بن کر کہنیوں پر بوجھ ڈال کے اپنا دھڑ اُوپر اُٹھایا ہوتا ہے، بالکل اسی طرح قلارے کا پائن حصہ تھا.... اُوپر کو اُٹھا ہوا، کہنیوں کے بل مشتاق دید سا!

قلارے بڑا ہی خوبصورت ستارہ تھا.... وسیع و عریض، ساکت و صامت، تازہ کٹی گھاس کی خوشبو سے لبریز۔ نیلی گھٹا سے اُترنے والی ٹھنڈی ہوا کے سفید سفید پرت بھورے رنگ کی زمین پر جگہ جگہ پڑے تھے اور سارے میں پلاٹینم کلر کی ملائم اور ہموار روشنی عریاں عریاں سی لیٹی تھی۔

شہزاد کا ستارہ کچھ اتنا بڑا نہیں تھا، پھر بھی کافی تھا۔ ہماری دُنیا سے تقریباً ایک براعظم کم اور ہمارے ہندوکش سلسلہ ہائے کوہ سے ہزار ہزار فٹ نیچے پہاڑ جو دور سے منجمد نیلی گھٹائیں دکھائی دیتے تھے۔ اُن کی چوٹیوں پر برف نہیں تھی، موسیقی کی صداؤں اور انحدباجے کی آواز کا انجماد تھا جو دور سے پیلے اور گلابی رنگ کے برف کے آثار نظر آتے تھے۔

سینکڑوں ہزاروں میل پھیلی ہوئی بھورے رنگ کی اس زمین پر براؤن کلر، کڈنی شیپ میرا زمین کا ایک ٹکڑا تھا.... کوئی پچاس میل لمبا اور بیس بائیس میل چوڑا۔ اس ٹکڑے کی رنگت مدینے شریف کے اُن اُونٹوں کی سی تھی جو مکہ مدینہ موٹروے کے دونوں طرف آزادانہ گھومتے نظر آتے ہیں۔

شہزاد اپنی پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر گنگناتا ہوا چلا۔ کچھ خوبصورت فضا کا اثر، کچھ اتنی بڑی جائیداد کا نشہ، کچھ جوانی اور خوبصورتی کی جھلار.... گاتا گاتا کچھ نرت سی بھی کرنے لگا اور نرت کرتا کرتا کافی دُور نکل گیا۔ ایسی تنہائی، ایسا سکون اور ایسا سناٹا اس نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی نرت میں آپ سے آپ اضافہ ہو گیا اور وہ باقاعدہ ناچنے لگا۔ یہ ناچ کسی اُصول کے تحت تو نہیں تھا لیکن اس کی حرکات کا مخرج بڑا بامعنی تھا۔ شہزاد کو خوشی ہوئی کہ وہ ناچ بھی سکتا ہے اور بڑی دُور تک ناچ سکتا ہے۔

لیکن اس کی یہ خوشی ایک دم حیرت، غصے اور اکراہ میں تبدیل ہو گئی جب اس نے فرلانگ بھر کے فاصلے پر ایک جوڑے کو اپنی زمین پر بیٹھے دیکھا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ انسان یہاں تک کیسے پہنچ سکا ہو گا لیکن وہ صاف انسان تھے اور انسان کی اولاد

میں سے تھے۔ شہزاد آہستہ آہستہ، سوچتا سوچتا، رکتا رکتا اور کھوجتا کھوجتا اُن کی طرف بڑھتا رہا۔

جب وہ ایک مناسب فاصلے پر پہنچ کر اُن کی پشتوں کے پیچھے رُکا تو لڑکی نے مرد کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے اپنی طرف انڈیلا اور اس کے چہرے پر اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے۔ مرد نے اُسے اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑا اور اس کا چہرہ بھنبھوڑنے لگا۔ لڑکی گھنٹیاں سی بجاتی اتنے زور سے ہنسی کہ شہزاد کو غصہ آ گیا۔ ایک تو اس کی جائیداد پر "ٹریس پاسنگ" دوسرے بے محابا بغل گیریاں، چمیاں اور قہقہے۔ اس سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے للکار کر اُونچی آواز میں کہا "ھو آر یو پیپل؟" لڑکے اور لڑکی دونوں نے اپنے چہرے گھما کر پیچھے دیکھا تو شہزاد نے پتلون سے اپنا پستول نکال لیا۔

اُسے اس حالت میں دیکھ کر رعنا نے اپنے دونوں ہاتھ تیزی سے ہلاتے ہوئے کہا "نو شہزاد نو، پلیز نو۔ فار گاڈز سیک ڈونٹ ڈو دس!"

جب اُس نے اپنے زمینی ونڈیٹا کے جذبے سے لبریز ہو کر پستول کا گھوڑا چڑھایا تو پروفیسر ندیم نے ہاتھ آگے بڑھا کر "پلیز ٹو میٹ یو ہیئر، شہزاد" کہا اور اس کے مصافحہ کا انتظار کرنے لگا۔ شہزاد نے اپنا پستول واپس پتلون کی جیب میں ڈالا اور پروفیسر ندیم سے لپٹ کر بولا "تو آپ پروفیسر ندیم ہیں! رعنا کے محبوب اُستاد!!"

پروفیسر ندیم نے ہنس کر کہا "میں نہ تو اس کا محبوب ہوں اور نہ ہی اس کا اُستاد۔ اس کے اُستاد تو سر حبیب ہیں، ٹیکسٹائل ڈیزائن کے ماہر۔ میں تو اُن کا پڑوسی ہوں اور ساتھ والے کمرے میں آئل کا کام کرتا ہوں۔"

شہزاد نے رعنا کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر حیرانی سے پوچھا "جان من تم یہاں پہنچیں کس طرح؟ یہ تو تقریباً ایک نوری سال کا راستہ ہے۔"

پروفیسر نے کہا "شہزاد صاحب یہ بڑی دیوانی لڑکی ہے، آپ کی منگیتر! پہلے تو اس نے آسٹرل باڈی کا علم سیکھا ایک ڈچ عورت سے...."

"وہ ڈچ نہیں تھی سر" رعنا نے بات کاٹی "وہ برسلز کی رہنے والی تھی۔ لیکن ہمارے یہاں چونکہ برسلز کو کم لوگ جانتے ہیں اس لئے اس نے اپنے آپ کو ڈچ کہنا اور ڈچ کہلوانا شروع کر دیا تھا۔"

"لیکن یہ آسٹرل باڈی کیا ہوتی ہے؟" شہزاد نے پوچھا تو رعنا نے جلدی جلدی اس کا خاکہ بیان کر کے بتایا کہ آسٹرل باڈی دراصل آؤٹ آف باڈی کے سفر کا نام ہے۔ جب آدمی بستر پر لیٹا لیٹا اپنے کمرے کے روشن دان میں پہنچ کر اس میں جمی ہوئی دھول اور دھول کے اندر مرا ہوا جھینگر دیکھنے لگ جائے تو آسٹرل باڈی کا پہلا مرحلہ ختم ہو جاتا ہے۔"

"لیکن رعنا نے صرف آسٹرل باڈی پر ہی توجہ نہیں دی" پروفیسر ندیم نے کہا "اس نے کچھ اور بھی کیا ہے اور جب یہ میرا ہاتھ پکڑ کر آتش بازی کی طرح اُوپر کو اُٹھتی ہے تو مجھے ایک تھرتھری سی لگ جاتی ہے۔"

"آپ لوگ کب سے یہاں آ رہے ہیں؟" شہزاد نے لاتعلقی سے پوچھا تو رعنا سوچ میں پڑ گئی۔ پروفیسر ندیم نے کہا "ہم کو تو کوئی مہینے سے اُوپر ہو گیا ہے۔"

"ہر روز یہاں آتے ہیں؟" شہزاد نے چیخ کر پوچھا۔

"نہیں" رعنا نے بالوں کو جھٹکا دے کر کہا "کوئی کوئی دن ناغہ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اتنی خوبصورت جگہ ہے کہ ناغہ کرنے کو دل نہیں چاہتا۔"

پھر اُن دونوں نے ایک ساتھ کہا "لو بھئی حد ہو گئی" اور پروفیسر ندیم نے پوچھا "آپ یہاں کس طرح سے پہنچے؟ ہمارے یہاں سے تو بالکل سیدھا رستہ ہے عمودی لیکن امریکا سے تو پہلے قطب جنوبی کی طرف پرواز کرنی پڑتی ہو گی۔"

شہزاد نے اُن کو تفصیل کے ساتھ اپنے ہفت خواں سے روشناس کرانے کے بعد پوچھا "آپ کے آسٹرل باڈی میں کوئی شق کمیونی کیشن کی بھی ہے جس سے پتہ چل سکے کہ آپ لوگ کب ٹیک آف کرنے والے ہیں؟"

رعنا نے کہا "میں نے آسٹرل باڈی کا میتھڈ تو کب کا چھوڑ دیا ہے۔ اب تو ہم ریمیا کے ذریعے یہاں پہنچتے ہیں۔ یہ مشرقی علم ہے اور بالکل فول پروف ذریعہ ہے۔ اس میں گھپلے کا اندیشہ نہیں۔ ریڈار آگے آگے چلتا ہے اور بروقت اطلاع دیئے جاتا ہے۔"

"اور علم ریمیا کس سے سیکھا؟" شہزاد نے پوچھا۔

"فلیمنگ روڈ پر، چوک برف خانے کے پاس" رعنا نے کہا "ایک موچی بیٹھتا

ہے۔ وہ علم ریمیا کا شہنشاہ ہے۔ میں نے اس کے پاؤں دبا کر یہ علم حاصل کیا۔"

"اور اس موچی کا پتہ تم کو کس نے دیا؟" شہزاد نے پوچھا۔

رعنا نے کہا "تمہیں وہ اماں بلوچن یاد ہے جو ہمارے گھر تھریڈنگ کے لئے آیا کرتی تھی.... اس نے بتایا تھا موچی کا پتہ۔"

"اس نے تو جان لڑا دی" پروفیسر ندیم نے چہک کر کہا "اور یہ مجھے سیف الملوک کی طرح اُٹھا کر یہاں لے آئی۔"

پھر وہ تینوں ایک دوسرے کے بازوؤں میں بازو ڈال کر بھوری اور گرے زمین پر چلتے رہے اور شہزاد سے اس کے سمیسٹر کی بابت پوچھتے رہے۔ رعنا فکرمند تھی کہ اب وقت کافی ہو گیا ہے اور شہزاد کو امریکا سے واپس آجانا چاہیے۔ پروفیسر ندیم کہہ رہے تھے کہ اب آخری دُم رہ گئی ہے اس کو گزار کر ہی آنا چاہیے خواہ ایک سمیسٹر اور لگ جائے۔

پروفیسر ندیم اور رعنا چونکہ مہینہ بھر سے یہاں آ جا رہے تھے اس لئے وہ قلارے کے زاویوں، موڑوں، چوراہوں، چھ راہوں اور لپکتی گہرائیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ جب بھی آپس میں بات کرتے، اس ستارے کی جغرافیائی صورت کے حوالے سے کرتے۔ شہزاد اُن کی باتیں سن کر ویسے ہی شرمندہ ہوتا جیسے ترقی یافتہ ممالک کے فہمیدہ اور زیرک ایکسپرٹ غریب اور پس ماندہ ملکوں کے حاکموں اور اہلکاروں کو اپنی گفتگو سے شرمندہ کیا کرتے ہیں۔ جو جو باتیں اس کے ستارے کے متعلق پروفیسر ندیم اور رعنا کو معلوم تھیں، اُن میں سے وہ ایک بھی نہیں جانتا تھا۔ لیکن پروفیسر ندیم اور رعنا مگیتر اس کی خفت دُور کرنے کے لئے مربیانہ انداز میں بار بار کہہ رہے تھے کہ "آپ چونکہ پہلی مرتبہ یہاں آئے ہیں اس لئے سب باتوں کا معلوم ہونا ضروری نہیں۔ آہستہ آہستہ سب پتہ چل جائے گا۔"

جب شہزاد واپس زمین پر پہنچا تو اس نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی تین گولیاں رعنا کی بڑی پورٹریٹ پر ماریں اور ساتھ اُونچی آواز میں کہا "کتی، حرام زادی!" پھر اس نے اپنی صدیوں پرانی خاندانی غیرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر زور زور سے اپنا سر دیوار سے ٹکرایا اور اُونچے اُونچے "اُوئے بے غیرتا! اوئے بے غیرتا!!" کہہ کر زار و

قطار رونے لگا۔

جب تک وہ کرہ ارض پر رہتا، رعنا اور ندیم کو قتل کرنے کے پروگرام بناتا رہتا۔ لیکن جب وہ اپنا پستول لے کر اور زہر کی سرنج بھر کر زمین کے مدار سے باہر نکلتا تو اس کو انتقام اور بدلے اور وینڈیٹا کے سارے داؤ بھول جاتے۔ وہ پرفیسر ندیم اور رعنا کے ساتھ مل کر لمبی لمبی سیروں پر نکل جاتا اور ہر مقام پر اُن کی خوشی اور خوشنودی کے راگ الاپ کر واپس آجاتا۔

زمین پر پہنچ کر پھر انتقام اور بدلے کی آگ میں جلنے لگتا اور جو کچھ اُوپر دیکھ چکا ہوتا، وہ بڑی سکرین پر رنگین فلم بن کر اُبھرتا اور قدم قدم پر اُسے خودکشی کی طرف مائل کرتا۔

یوں تو زمین میں بھی ایک طرح کی کشش موجود تھی اور اس کا سارا نظام اسی کشش سے بندھا تھا لیکن یہ کشش اجرام فلکی کی کشش سے بہت مختلف تھی۔ زمین کی کشش، کشش ثقل تھی اور اس کے اپنے ستارے قلارے کی کشش صیقل تھی۔ کشش ثقل انسان کو انسانوں کے قتل پر آمادہ کرتی تھی اور پھر قتل کرنے پر مجبور بھی کرتی تھی۔ کشش صیقل ہر طرح کے داغ، دھبے، نفرت، کدورت، کام، کرودھ، لوبھ اور استکبار کو دور کرکے دل کو آئینہ سا بنا دیتی تھی۔ اس میں جب بھی اپنی شکل دکھائی دیتی، اچھی دکھائی دیتی اور جب بھی اپنا آپا نظر آتا، پھول پنکھڑی کا مجموعہ نظر آتا۔

یہاں کا نظام اور یہاں کی فضا زمین سے بالکل مختلف تھی۔ گردش خون اور تنفس کا نظام بالکل اور طرح کا تھا۔ بھوک لگتی تو تھی مگر یاد نہیں رہتا تھا کہ بھوک لگی ہے۔ کچھ کھاؤ تو کھایا بھی جاتا تھا لیکن اگر یاد نہ رہے تو کوئی تکلیف بھی نہیں ہوتی تھی۔

شہزاد نے پروفیسر ندیم سے پوچھا کہ "سر آپ تو یہاں کافی آتے جاتے ہیں...."
"بلکہ ہر روز ہی آتے ہیں" رعنا نے بات کاٹ کر کہا تو شہزاد نے اُسے فہمائش کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا "پروفیسر صاحب ہم دونوں کے بڑے ہیں۔ جب میں اُن سے بات کروں تو تم کو چپ رہنا چاہیے۔" پروفیسر صاحب نے کہا "کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں" لیکن رعنا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں شہزاد سے معافی مانگی اور کرسٹل

ڈسٹ کے ایک ٹیلے کی طرف دیکھنے لگی۔

شہزاد نے کہا "سر! میں آپ سے یہ پوچھ رہا تھا کہ آپ تو یہاں کافی آتے جاتے ہیں، کیا اس تنہائی میں نفسانی خواہشات اپنا زور نہیں دکھاتیں؟ میں نے تو یہاں آ کر جب بھی دیکھا ہے، نفسانی خواہشات بند سی ہونے لگتی ہیں!"

"بند سی ہونے لگتی ہیں؟" پروفیسر ندیم نے حیرانی سے پوچھا۔

"جی سر" شہزاد نے سر جھکا کر کہا "جیسے بدن کے اندر اور باہر بے شمار ڈبیاں ہوں... کچھ کھلے منہ کی، کچھ تنگ منہ کی، وہ سب یہاں پہنچتے ہی کٹک کٹک کر کے بند ہونے لگتی ہیں۔ مجھے تو اُن کی آوازیں بھی صاف سنائی دیتی ہیں.... جیسے انگلیوں کے پٹاخے نکالنے کی آواز ہو۔ ویسی۔"

پروفیسر ندیم نے ہنس کر کہا "ڈبیاں تو ہماری بھی بند ہو جاتی ہیں لیکن آواز کبھی نہیں سنائی دی کہ بند ہو رہی ہیں۔"

رعنا نے کہا "میری تو ساری کی ساری اسی طرح سے کھلی رہتی ہیں لیکن اُن میں کچھ ہوتا نہیں۔"

"ایسے ہو سکتا ہے سر!" شہزاد نے چہک کر پوچھا "کہ نفسانی خواہشات کی ڈبیاں کھلی رہیں اور اُن کے اندر کچھ نہ ہو؟" پروفیسر ندیم نے کہا "اس ستارے کی ساخت میں اور ساری کجیاں تو ہماری زمین جیسی ہیں لیکن اس میں تکبر اور انانیت کا جزو شامل نہیں ہے۔ اور جس بنتر اور بناوٹ میں استکبار کے اجزا شامل نہ ہوں، وہاں شیطان کا عمل دخل نہیں ہوتا اور وہاں ابلیس کا اغوا ممکن نہیں رہتا۔ اور جو علاقہ شیطان اور اس کے لشکر کی دسترس میں نہ ہو، وہاں خواہشات نفسانی کی ساری ڈبیاں بھی کھل جائیں تو وہ خالی ہی رہتی ہیں۔ اصل میں اُن کو آگ دکھانے والا اور شعلہ بھڑکانے والا شیطان ہی ہوتا ہے۔"

"شیطان کے پاس ایک بہت ہی چھوٹا سا ہتھیار ہوتا ہے.... نظر نہ آنے والا، منا سا ہتھیار.... لیکن بے حد خطرناک اور سو فیصد مہلک!" یہ کہہ کر رعنا رکی اور کافی دیر تک خاموش رہی۔

"کون سا ہتھیار؟" شہزاد نے بے چینی سے پوچھا "کس قسم کا ہتھیار؟"

"بالکل ہی چھوٹا سا، منا سا، میرے اس ناخن کے برابر!" رعنا نے چترائی سے جواب دیا۔ "لیکن وہ ہوتا کیا ہے؟" شہزاد نے سر جھٹک کر پوچھا تو رعنا مسکرا کر بولی بس ایک لائٹر ہوتا ہے، سگریٹ لائٹر جیسا.... لیکن اس میں پیٹرول یا گیس نہیں ہوتی، لیزر کی لپک ہوتی ہے۔ یہ لپک کوندے کی طرح دور تک بلکہ بہت ہی دور تک پہنچ جاتی ہے اور نارنجی آگ کی باڑھ مار دیتی ہے۔"

پروفیسر ندیم بڑے غور سے رعنا کی بات سن رہا تھا۔

رعنا نے کہا "شیطان جب چاہتا ہے، وہ اپنے تھمب نیل لائٹر سے خواہشات نفسانی کی ڈبیا میں اپنا کوندا پھینکتا ہے اور سارے وجود میں آگ لگا دیتا ہے۔"

"کون سی ڈبیا میں؟" شہزاد نے گھبرا کر پوچھا تو رعنا نے کہا "جب کسی ایک خواہش کی ڈبیا کھلتی ہے تو اس کے ساتھ دوسری خواہشات کی ڈبیاں بھی آپ سے آپ کھل جاتی ہیں — جونہی شیطان کے لائٹر کا کوندا ایک خواہش کو اگنائٹ کرتا ہے، دوسری ساری ڈبیاں بھی ایک ساتھ بھڑک اُٹھتی ہیں: کام، کرودھ، غصہ، شہوت، لالچ، موہ، جلہ، تکبر، اہنکار سب بھڑ بھڑ کر کے ایک ساتھ جلنے لگتے ہیں۔"

پروفیسر ندیم اور شہزاد چوروں کی طرح ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔

"لیکن ہمارے یہاں، اسی ستارے میں" رعنا نے کہا "شیطان اور اس کی ذرّیات نہیں ہیں۔ چونکہ ہماری سطح کے اندر کشش ثقل نہیں بلکہ کشش صیقل ہے اس لئے یہاں تکبر اور غرور کا وجود نہیں ہے۔" اور جس مقام پر تکبر اور گھمنڈ نہ ہو، وہاں شیطان کا حکم نہیں چلتا۔"

شہزاد نے کہا "میں تمہاری بات سمجھا نہیں!"

رعنا نے ایک سنجیدہ مقرر کی طرح اُنگلی اُوپر اُٹھا کر کہا "وجہ یہ ہے کہ شیطان کا وجود کبر سے تخلیق کیا گیا ہے۔ اب جس خطے یا منطقے میں غرور، تکبر، گھمنڈ یا ابھیمان نہیں ہو گا وہاں شیطان داخل ہو ہی نہیں سکے گا۔"

اس نے شہزاد کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ پنکھے کی طرح ہلا کر کہا "بھئی جس جس علاقے میں ریل کی پٹڑی ہی موجود نہ ہو، وہاں ٹرین کس طرح سے داخل ہو سکتی ہے اور انجن کس طرح سے شنٹ کر سکتا ہے!"

شہزاد نے رعنا کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنی کلائی کی گھڑی دیکھ کر پروفیسر ندیم سے کہنے لگا "سوری سر! میں یہاں اور زیادہ دیر تک رک نہیں سکتا۔ میرا سمیسٹر ختم ہو رہا ہے اور مجھے ابھی بہت ساری اسائن منٹس نمٹانی ہیں۔ میں آپ لوگوں سے اجازت چاہوں گا۔"

رعنا نے کہا "ذرا سے تو اور رکو شہزاد!"

شہزاد نے کہا "میں تو ہمیشہ کے لئے یہاں رک جاؤں لیکن پھر میرا بڑا نقصان ہو جائے گا اور اس کی تلافی عمر بھر نہ ہو سکے گی۔ آپ لوگ بیٹھیں، میں پرسوں پھر آجاؤں گا.... اسی وقت، بلکہ اس سے بھی دو گھنٹے پہلے!"

پیشتر اس کے کہ ندیم اور رعنا کچھ اور کہتے، شہزاد شُرکر کے نیچے اُترنے لگا۔

جونہی وہ زمین کے مدار میں داخل ہوا اور اس کے وجود پر کشش ثقل کی کھینچ پڑی تو اُس نے ندیم اور رعنا کو ماں بہن کی گندی گالیاں دینا شروع کر دیں اور تھوک کے بڑے بڑے تھوبے زمین پر گرانے لگا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کرہ ارض کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لمبی سے دھار مارتا ہوا گزر جائے لیکن ابھی اس کے پاس اتنا سٹاک نہیں تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے دراز سے آٹومیٹک نکالی اور کھڑکی سے باہر تواتر کے ساتھ فائر کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ پشتو، پنجابی اور ہندکو میں اُونچے اُونچے گالیاں نکالنے لگا۔

جب اس کا غصہ قدرے کم ہوا تو اس نے پراپرٹی ڈیلر کو فون کر کے اپنے ستارے کا نام، پتہ، محل وقوع اور رجسٹریشن نمبر دے کر کہا "میں اسے ابھی بیچنا چاہتا ہوں۔ ابھی، اسی وقت۔ کوئی بھی گاہک ہو.... کہیں کا بھی ہو، اس کے ساتھ سودا طے کر لو۔"

رئیل اسٹیٹ کی لڑکی نے پوچھا "آپ کے پاس سوئزرلینڈ کا رجسٹریشن نمبر ہے؟"

شہزاد نے کھٹ کھٹ نمبر اور اس کا کوڈ زبانی بتا دیا۔ لڑکی نے کہا "گاہک تو ضرور ہیں سر پر آج کل ستاروں کی سیل کا ذرا مندا ہے۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ہم

اسے اسی قیمت پر بیچ سکتے ہیں جس پر آپ نے یہ ستارہ خریدا تھا۔"

"ضرور! ضرور!! ضرور!!!" شہزاد نے چلّا کر کہا "اگر اس سے دس ڈالر کم بھی ملیں تو بھی سودا کر لیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ حرام زادے جو اس وقت میرے کوکب کی پاکیزہ سطح پر بیٹھے گلچھرے اُڑا رہے ہیں، اُن کو نیا مالک ٹھڈے مار کر باہر نکال دے اور ان خلاف کار متجاوزوں کو دھکے دے کر کشش ثقل کے حوالے کر دے۔"

پھر وہ اُونچے اُونچے رونے لگا اور اس کے رونے میں روئے زمین کا سارا کرب کھچ کر اس کی سسکیوں میں شامل ہو گیا!

بدنی ضرورت

آج جب وہ بابے سے دو روپے کے دہی بھلے اور پچاس پیسے کا کھلا چاٹ مسالہ لینے آئی تو کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کے سامنے ریڑھی پر بابے کی جگہ ایک نوجوان کھڑا تھا جس کا قد درمیانہ، بال گھنگھریالے اور مونچھیں موٹی تھیں۔

اس نے سلور کا کٹورہ آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا "آج بابا نہیں آیا؟" تو صدیق نے بھلے ڈالتے ہوئے جواب دیا "اب وہ یہاں نہیں آئے گا، میں نے اس کا اڈہ خرید لیا ہے۔"

لڑکا پلاسٹک کی گندی پلیٹ میں بھلے اور بوندی لے کر ایک طرف کو ہوگیا تو رضیہ صدیق کے ذرا اور قریب ہو کر پوچھنے لگی "اب بابا کیا کرتا ہے؟"

"ریڑھی لگاتا ہے، اور کیا کرنا ہے اس نے!"

"ریڑھی پر بیچتا کیا ہے لیکن؟" رضیہ نے "لیکن" پر زور دے کر پوچھا تو صدیق نے چہرہ اوپر اٹھا کر غور سے رضیہ کو دیکھا اور اس کی نگاہیں جوان لڑکی کی گردن پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ پھر اس نے جلدی سے گردن کے اردگرد کا علاقہ دیکھ کر جواب دیا "بابا بھی بھلے ہی بیچتا ہے، اور کیا بیچنا ہے، اس نے لیکن وہ اپنی ریڑھی شالامار کے دروازے پر لے گیا ہے۔"

رضیہ کھانسی تو اس کی پھوار کا ایک ابخرہ صدیق کی مونچھوں کے اندر گھس گیا۔ مونچھوں کی جھاڑی میں اس چھوٹے سے خرگوش بچے سے بے نیاز صدیق نے کٹورہ ہاتھ میں لے کر پوچھا "کیا؟"

رضیہ نے کہا "دو روپے کے بھلے اور پچاس پیسے کا کھلا چاٹ مسالہ!"

دو روپے کے بھلے اور چاٹ مسالے کی پڑیا لے کر جب رضیہ بلبوں والے